© rasailojaraid.com

کانفرنس ۲۲ مارچ کو ختم ہوئی۔ آخری نشست جو شام کے پانچ بجے سے شروع ہو کر شب میں ۹½ بجے تک چلتی رہی تھی اس میں روزانہ کے پروگرام کے علاوہ اتحاد اسلامی اور فارسی کے ساتھ عربی زبان کو فروغ دینے اور شیخ طوسی کے مخطوطات کو جمع کرنے کی تجاویز بھی منظور ہوئیں۔ اور ساتھ ہی موقع کی مناسبت سے کچھ نظمیں بھی سنائی گئیں۔ ایک نظم جو کم و بیش تین سو اشعار پر مشتمل تھی عربی میں تھی اور اس کے مصنف استاد صلاح الصاوی تھے۔ آخر میں دعا ہوئی اور جشن ہزار سالہ طوسی کا پروگرام ختم ہو گیا۔

ظاہر ہے شیخ طوسی فرقۂ امامیہ شیعہ کے بہت بڑے امام اور مجتہد ہیں اور ان کے جشن ہزار سالہ کا اہتمام و انتظام کرنے والے بھی سب شیعہ ہی تھے۔ لیکن اس کے باوجود بیرون ایران سے مشہد یونیورسٹی کی براہ راست دعوت پر یہاں آنے والے جتنے بھی تھے سنّی تھے۔ ایک آدہ کوئی شیعہ ہو تو ہو۔ مجھے معلوم نہیں۔ عراق سے تو آج کل ایران کے تعلقات دوستانہ نہیں ہیں۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان میں تو بڑے بڑے علما و مجتہدین شیعہ موجود ہیں۔ اور ان دونوں ملکوں سے ایران کے تعلقات بھی دوستانہ ہیں۔ اس بنا پر یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ ارباب جشن نے اس موقع پر ان حضرات شیعہ کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ اپنے رفیق کار مولانا سید علی نقی نقوی صاحب کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ دعوت نامہ ان کے نام بھی آیا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنا مقالہ بھیجدیا اور خود نہیں گئے۔ اور ایک گفتگو میں اس کی وجہ یہ بتائی کہ "ہمارے ہاں عزا چالیس روز یعنی چہلم تک چلتا ہے اور ایران میں عشرۂ محرم پر ختم ہو جاتا ہے"۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ پاکستان سے بھی کوئی شیعہ عالم شریک نہیں ہوئے۔ بہرحال یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس جشن ہزار سالۂ طوسی میں سنی اور شیعہ دونوں اس طرح متحد اور برابر کے شریک رہے کہ امتیاز این و آں اٹھ گیا۔ پھر جہاں تک مقالات کا تعلق ہے تو میں نے خود اپنے مقالہ میں شیخ طوسی کے علمی و عملی اوصاف و کمالات کے اعتراف کے ساتھ بعض آیات کی تفسیر میں ان سے اختلاف اور شیخ کے وجوہ تفسیر پر نقد کیا تھا۔ اسی طرح پروفیسر صغیر حسن معصومی نے اپنے مقالہ میں شیخ کے بعض فتاوی پر نقد و جرح کر کے ان کو رد کیا تھا۔ ہم دونوں کے مقالات کے اس حصہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر خالص علمی انداز میں بحث و گفتگو ضرور ہوئی۔ لیکن دونوں مقالات جوں کے توں ٹائپ کر کے تقسیم کئے گئے اور بجز اس کے کہ مقالات کمیٹی میں موخر الذکر مقالہ کے متعلق ایک صاحب نے جوش میں آکر کہدیا کہ میں اس پر مناظرہ کرنے کو تیار ہوں۔ عام برہمی کا اظہار نہیں کیا گیا اسی طرح ڈاکٹر صلاح الدین المنجد کا مقالہ عربوں کی کا اس پر اثر" پر تھا۔ ظاہر ہے فن تاریخ سے عربوں کی دلچسپی کی کوئی داستان امیر معاویہؓ اور ان کے پوتے خالد بن یزید کے تذکرہ کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ مقالہ نگار نے ان دونوں کا اور ساتھ ہی بنو امیہ کا ذکر بڑے طمطراق سے کیا۔ میں نے اس وقت کانفرنس پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ مقالہ کے اس حصہ کو سنکر بعض چہرے اتر ضرور گئے تھے۔ لیکن جب مقالہ ختم ہوا تو پورے ہاؤس نے گرم جوشی کے ساتھ چیرز دیئے۔ علاوہ ازیں غور کیجئے تو رواداری اور فراخدلی کا یہ مظاہرہ بھی کچھ کم نہیں تھا کہ اس کانفرنس کا صدر استاد علال الفاسی کو منتخب کیا گیا جنھیں اپنے سنی ہونے پر فخر تھا۔ استاد علال الفاسی نے خود اپنی اور اہل سنت والجماعۃ کی طرف سے وسیع المشربی اور صلح روی کا اظہار اس طرح کیا کہ جمعہ کے روز جب نماز کا وقت قریب آیا تو انھوں نے کانفرنس کو ملتوی کرتے ہوئے بڑے جوش کے ساتھ اعلان کیا کہ نماز فلاں ہال میں ہوگی اور ہم سب علامہ الحاج آیت اللہ میرزا خلیل کمرہ ای کی امامت میں نماز جمعہ ادا کریں گے۔ موصوف ایران کے نہایت مشہور اور ممتاز دینی اور روحانی پیشوا ہیں۔ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں اور مریدوں اور معتقدین کا ایک وسیع حلقہ رکھتے ہیں۔ جب کبھی کسی مقالہ میں شیعہ سنی اختلاف کا ذکر کسی نامناسب انداز میں آیا۔ علامہ موصوف نے فوراً کھڑے ہو کر صاحب مقالہ کو ٹوکا اور کہا کہ یہ اختلاف بنیادی نہیں ہے کیونکہ جس قرآن و سنت پر سنیوں کا ایمان ہے شیعوں کا ایمان بھی اسی پر ہے اور ہم شیعہ اس قرآن میں نہ ایک حرف کم مانتے ہیں اور نہ زیادہ[1]۔ البتہ ان دو طبقوں کا اختلاف بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ فقہاء کا باہمدگر ہوتا ہے: یعنی اصول دین میں سب ایک ہیں۔ البتہ اجتہاد اور استنباط مسائل و استخراج احکام میں مختلف ہیں۔

---

[1] واضح رہنا چاہئے کہ علمائے عصر حاضر میں آیت اللہ الحاج میرزا خلیل کمرہ ای ہی قرآن مجید سے متعلق اس خیال میں منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ عہد حاضر میں مشہور شیعی مفسر صاحب لآلی القرآن بھی اپنی تفسیر کے مقدمہ میں یہی بات بڑی قوت سے لکھ چکے ہیں اور اسلاف میں شیخ طوسی، علامہ طبرسی اور دوسرے حضرات نے بھی یہی لکھا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استدراک

جون کے برہان میں "النبأ العظیم" کے ماتحت ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی نسبت یہ لکھا گیا تھا کہ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی میں "شعبۂ اسلامی تاریخ و ثقافت" قائم کیا تھا۔ اس کے متعلق مخدوم و محترم پروفیسر محمد زبیر صاحب صدیقی تحریر فرماتے ہیں:

"کلکتہ یونیورسٹی میں میرا تقرر ۱۹۲۹ء میں ہوا تھا۔ اس زمانہ میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر اسکوٹش چرچ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اورکاہارٹ تھے۔ ڈاکٹر مکرجی سنڈیکیٹ کے ۱۶ ارکان میں سے ایک رکن تھے۔ اس زمانہ میں محکمۂ اسلامی تاریخ و ثقافت کے قیام کا خیال بھی کسی کے دماغ میں نہیں تھا۔ اس کا خیال تو ڈاکٹر پی۔ این بنرجی کے دماغ میں آیا اور انھوں نے دس سال کے بعد جب سر عزیز الحق وائس چانسلر ہوئے تو ان کی توجہ اس محکمہ کے قیام کی طرف مبذول کرائی۔ سر عزیز الحق نے اس کے لئے بہت کوشش کی۔ اراکین سنڈیکیٹ و سینیٹ کی ہمدردی اور اعانت حاصل کی اور اسلامی تاریخ و ثقافت کا محکمہ قائم کیا اور خود ہی اس محکمہ کے صدر رہے۔ جب وہ یونیورسٹی سے الگ ہوئے تو مجھے عربی و فارسی کے محکمہ کے ساتھ صدر بنایا گیا اور کئی برسوں تک میں دونوں محکموں کا صدر رہا۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کا رسوخ آہستہ آہستہ یونیورسٹی میں بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ یونیورسٹی کے مخلص بہی خواہ تھے اور ہمیشہ اس کی ترقی کے لئے پوری کوشش کرتے رہے۔ میرے بھی وہ مخلص اور سچے دوست تھے اور میرے ہر کام میں وہ میری ہر طرح مدد کرتے رہے۔ لیکن آپ نے جو باتیں لکھی ہیں ان میں صداقت نہیں ہے۔ آپ نے اپنی تحریر میں صرف اپنی یاد پر بھروسہ کیا اور آپ سے سہو ہو گیا۔"

© rasailojaraid.com